ارض القرآن کی رُودادِ سفر

(از محمد عاصم صاحب (رفیقِ سفر)

۱۹۵۶ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پہلی مرتبہ عرب ممالک کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ حج و زیارت کے علاوہ مولانا کا ارادہ تھا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے تمام آثار کو بھی دیکھا جاتے، لیکن ایک تو گرمی کا سخت موسم، دوسرے وقت کی کمی اور تیسرے مولانا کی صحت کی خرابی۔ اس لیے مولانا کی یہ دلی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ یوں بھی حج کی مصروفیات اور حجاج کی گہما گہمی میں اس قسم کی کسی خواہش کا پورا ہونا کوئی آسان بات نہیں جیتو جیتا جب انسان پہلی مرتبہ حج کے لیے جاتا ہے تو اسے پوری کوشش کے باوجود یہ سجھائی ہی نہیں دیتا کہ حج کی ضروری مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے کسی علمی قسم کے پروگرام کیونکر شروع کرے اور کیونکر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ بہت سی چیزوں کی خواہش اپنے دل میں لے کر وہ سرزمین حجاز میں قدم رکھتا ہے، اور وہاں پہنچ کر ان کے لیے کوشش بھی کرتا ہے، لیکن جب وہاں سے پلٹتا ہے تو اس کے دل میں یہ احساس برابر چٹکیاں لیتا رہتا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنے کسی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت سفر حج کے بعد مولانا پر بھی طاری ہوئی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران وہ وہاں کے تاریخی آثار دیکھنے کے لیے نکلتے بھی رہے لیکن اتنا وقت اور سکون ان کے پاس کہاں کہ وہ ان آثار کا تفصیلی مطالعہ کر سکیں۔ چنانچہ سفر سے واپسی ہی پر مولانا نے یہ طے کیا کہ آئندہ کبھی سردی کے موسم میں عمرہ بھی کیا جاتے اور سرزمین عرب کے تمام تاریخی آثار و مقامات کا بھی تفصیل سے مطالعہ کیا جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حج اور عمرے کے الگ الگ فائدے

ہیں۔ حج تو فرض ہی ہے اس لیے اس میں جو فائدے ہیں وہ عمرہ سے حاصل نہیں ہو سکتے، لیکن عمرہ کو ایک نفلی عبادت قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے اس میں جو فائدے رکھے ہیں، وہ بھی ایسے ہیں کہ ایامِ حج میں حج کے ساتھ محض ضمنی طور پر انہیں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن صحت کی مسلسل خرابی اور مشاغل کی زیادتی نے مولانا کو تین سال تک، اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی مندرجہ بالا خواہش پوری کرنے کے لیے عرب ممالک کا سفر کر سکیں بلکہ، میں مارشل لا نافذ ہو جانے کے بعد مولانا کو اپنے مسلسل کاموں سے جو یک گونہ رخصت ملی، تو ان کے ذہن نے بھی قدرے راحت محسوس کی اور اپنے علمی پروگراموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی فکر ان کے دماغ پر مسلط رہنے لگی۔ گزشتہ چند ماہ کے علاج سے صحت کے بارے میں بھی مولانا کو اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ سفر کی صعوبتوں کو بہر حال جھیل سکیں گے

اب مولانا نے اپنے ذہن میں سرزمینِ عرب کے سفر کا وسیع نقشہ بنایا اور طے کیا کہ نہ صرف حجاز کی زیارت کی جائے، بلکہ نجد، حجاز، شرق اردن، فلسطین، شام اور مصر کے بھی ان تمام آثار و تاریخی مقامات کو دیکھا جائے جن کا ذکر قرآن مجید اور سیرت پاک کی کتابوں میں آیا ہے۔ عراق میں بھی اگرچہ قرآن، سیرت اور اسلامی تاریخ سے متعلق آثار کی کمی نہیں، لیکن موجودہ حالات میں ایک پاکستانی ——— اور وہ بھی مولانا مودودی ——— کے لیے عراق کا سفر کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ مولانا کے بقول جسے گولی کھانی ہو، وہ اس زمانے میں ادھر کا رُخ کرے اور اگر گولی کھانی ہی ٹھہری تو اس کے لیے عراق جانا ہی کونسا ضروری ہے؟

گذشتہ سال کے وسط میں مولانا نے سعودی عرب، اردن اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفراء مقیم کراچی کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا اور ان سے یہ خواہش کی کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کو خطوط لکھ کر معلوم کریں کہ وہ اس قسم کے علمی سفر کے سلسلے میں انہیں کہاں تک سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہیں، کیونکہ ان ملکوں میں مطلوبہ تاریخی آثار کو دیکھنا اس وقت تک

ممکن نہیں جب تک ان کی حکومتوں کا تعاون یا کم از کم ان کی طرف سے ہر جگہ جانے کی اجازت حاصل نہ ہو۔ پھر موجودہ سیاسی حالات میں بھی یہی مناسب تھا کہ سفر سے پہلے متعلقہ ممالک کی حکومتوں سے پوچھ لیا جائے۔

سعودی سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے تو نہ صرف ویزا دینے کا وعدہ کیا بلکہ یقین دلایا کہ سعودی حکومت مولانا کو اپنے ملک میں داخل ہونے کے بعد سفر کے سلسلے میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائے گی۔ کچھ اسی قسم کا جواب اردن کے قونصل استاذ ہاشم اتل نے بھی دیا۔ لیکن جمہوریہ عربیہ کی طرف سے کوئی جواب کراچی چھوڑنے تک وصول نہ ہوا۔ تاہم مولانا نے اس خیال سے سفر کی تیاری جاری رکھی کہ اگر مصر و شام جانا نہ بھی ہوا تو فی الحال سعودی عرب اور اردن (مع فلسطین) ہی پر اکتفا کریں گے۔

اس کے بعد سوال ایکسچینج کا تھا کہ معلوم نہیں موجودہ حالات میں ہماری اپنی حکومت اتنا ایکسچینج دیتی بھی ہے کہ نہیں جس سے یہ سفر کیا جا سکے۔ سٹیٹ بنک کو پانچ ہزار روپے ایکسچینج کے لیے درخواست دی گئی۔ لیکن اس نے صرف سوا تین ہزار کا ایکسچینج (۲۵۰ پونڈ) دینے کا وعدہ کیا۔ اگرچہ یہ رقم مولانا کے پیش نظر سفر کے لیے بالکل ناکافی تھی، لیکن مولانا نے خدا کے بھروسے پر اس کو قبول کر کے سفر کا عزم کر لیا

مولانا نے اپنی رفاقت کے لیے دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا بھی فیصلہ کیا۔ ایک کراچی کے چودھری غلام محمد صاحب اور دوسرے مجھے۔ سفر کی نوعیت بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ اس میں کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری تھا۔

چودھری غلام محمد صاحب تو کویت میں اپنے متعلق جاننے والوں کے اصرار اور دعوت پر ۱۰ اکتوبر ہی کو کراچی سے کویت روانہ ہو گئے، اور یہ طے پایا کہ جب ہم (مولانا اور میں) اپنے پروگرام کے مطابق ظہران (سعودی عرب) پہنچیں گے تو وہ کویت سے ہمیں وہیں آ ملیں گے

لاہور سے روانگی ہم (مولانا اور میں) نے لاہور ہی میں ہیضے اور چیچک کے ٹیکے لگوائے،

کیونکہ سعودی عرب، اردن اور جمہوریہ عربیہ کا ویزا حاصل کرنے سے پہلے ان کا لگوانا ضروری تھا۔ پھر ۲۲ اکتوبر کو ہم بذریعہ خیبر میل لاہور سے روانہ ہو کر ۲۳ کی صبح کراچی پہنچ گئے۔ مولانا کے اس سفر کی اطلاع ایک دن پہلے تسنیم میں آچکی تھی۔ اس لیے احباب و رفقاء تقریباً ہر اسٹیشن پر آکر مولانا سے ملاقات کرتے رہے۔ یہ سلسلہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے یعنی روہڑی سٹیشن تک جاری رہا۔ اس کے بعد رات زیادہ ہو گئی تھی اور مولانا کے سونے کا وقت تھا۔ اس لیے حیدرآباد یا اگلے کسی سٹیشن پر کوئی صاحب ملاقات کے لیے نہیں آئے۔ لوگوں نے عقلمندی کی، ورنہ مولانا کو نیند کی حالت میں بیدار ہونا پڑتا۔

کراچی کا قیام ہمارا خیال کراچی میں زیادہ دن ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ کراچی سے ہر ہفتہ ایک بحری جہاز بصرہ جاتا ہے۔ ۲۷ اکتوبر کو ایک جہاز کے جانے کی تاریخ تھی۔ ہمارا پروگرام اسی سے روانہ ہونے کا تھا۔ خیال تھا کہ تین چار دنوں میں ویزا، ایکسچینج اور ٹکٹ کے تمام مراحل طے ہو جائیں گے اور ہم ۲۷ کو بآسانی روانہ ہو سکیں گے مگر بعض اوقات معمولی سی بات پر کوئی ایسا اڑنگا لگ جاتا ہے کہ آدمی کا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

ویزوں کے حصول میں ہمیں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ سعودی عرب کے سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے نہ صرف یہ کہ ویزا دیا بلکہ ایک روز انہوں نے ہماری شاندار دعوت بھی کی، ہمارے سفر کے متعلق اپنی حکومت اور ریاض کے بعض علماء کو بذریعہ تار اطلاع دی اور تین خط دستی ہمارے حوالے کیے، ایک ہر اس سعودی آفیسر کے نام جو سرحد پر کسی دوسری جگہ متعین ہو تاکہ سفر کے سلسلے میں وہ ہماری ہر ممکن مدد کرے، دوسرا ریاض کے شیخ عبداللطیف بن ابراہیم (دینی معاہد کے نگران اور مفتی اکبر شیخ محمد ابراہیم کے چھوٹے بھائی) کے نام اور تیسرا ریاض ہی کے شیخ عبدالعزیز بن باز کے نام۔

اردن کے قونصل استاذ ہاشم التل نے بھی نہ صرف ویزا دیا بلکہ انہوں نے مولانا سے خصوصی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ایک روز مولانا ان کے ہاں گئے، تو انہوں نے بتایا کہ میں

آج ہی ایک کام کے سلسلے میں دو ہفتہ کے لیے اپنے ملک جا رہا ہوں، وہاں تمام متعلقہ افسران کو میں آپ کی آمد کی اطلاع دے دوں گا تاکہ اردن میں داخل ہونے کے بعد آپ کو سفر کے سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائی جا سکیں۔ انہوں نے بھی ایک خط سرحد پر کسٹم والوں کے نام دستی طور پر ہمارے حوالے کیا۔

جمہوریہ عربیہ کے سفیر استاذ طٰہٰ فتح الدین سے بھی بآسانی ویزا مل گیا۔ مصر کے سفر کے سلسلے میں یوں تو ہمیں کسی پریشانی کا اندیشہ نہ تھا، صرف یہ خیال تھا کہ ہم مصر کا سفر صرف جبل طور (سینا) کے لیے اختیار کر رہے ہیں اور سینا ان دنوں فوجی علاقہ ہے جہاں کوئی مصری بھی حکومت کی خصوصی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اس لیے ایسا نہ ہو کہ ہم وقت اور پیسہ خرچ کر کے مصر پہنچیں اور وہاں ہمیں یکایک یہ معلوم ہو کہ سینا میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ تاہم ہم نے جمہوریۂ عربیہ کے سفیر سے گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ طے کیا کہ سینا کی اجازت کے سلسلے میں جمہوریۂ عربیہ کے سفیر متعینہ سعودی عرب سے گفتگو کی جائے گی۔

ویزا کے حصول کے بعد سٹیٹ بنک سے ۷۰ پونڈ کا ایکسچینج بھی بروقت مل گیا لیکن عین وقت پر جو اڑنگا لگا وہ ٹکٹ کے سلسلے میں تھا۔ ہمارا ارادہ اپنا سفر سعودی عرب سے شروع کرنے اور سعودی عرب میں بھی خُبَر (مشرقی ساحل کی بندرگاہ) کے راستے سے داخل ہونے کا تھا۔ یہ ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ حج کے دنوں کے سوا باقی ایام میں کراچی سے جدہ براہ راست کوئی جہاز نہیں جاتا، اور اگر کوئی جہاز جاتا بھی ہے تو سعودی حکومت کی طرف سے جدہ کے راستہ داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن جب ہم نے خُبَر جانے کے لیے جہاز ران کمپنی سے رجوع کیا، تو معلوم ہوا کہ کراچی سے جو جہاز بصرہ جاتے ہیں وہ خُبَر پر نہیں ٹھہرتے۔ اس لیے جن لوگوں کو کراچی سے خُبَر جانا ہوتا ہے وہ پہلے بحرین اترتے ہیں اور پھر لانچ یا ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے خبر جاتے ہیں اب گویا ہمیں بحرین کے ویزا کی ضرورت پیش آئی؛ اور نہ بحرین کا اندراج نہ مولانا کے پاسپورٹ میں تھا نہ میرے پاسپورٹ میں۔ خیال ہوا کہ شاید بحرین کا ٹرانزٹ ویزا اندراج کے بغیر ہی مل جائے۔

لیکن جب برطانوی ہائی کمشنر کے دفتر سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ پاسپورٹ میں بحرین کا اندراج بہرحال ضروری ہے۔ اس روز اکتوبر کی ۲۶ تاریخ ہو چکی تھی اور اگلے روز جہاز روانہ ہو رہا تھا۔ ایک دن میں کسی طرح ممکن نہ تھا کہ پاسپورٹ میں بحرین کا اندراج بھی کرایا جائے، بحرین کا ویزا بھی لیا جائے اور پھر جہاز راں کمپنی سے ٹکٹ بھی۔ طوعاً و کرہاً سفر کا ارادہ ایک ہفتہ اور مؤخر کرنا پڑا۔

اگلے روز پاسپورٹ آفس میں بحرین کے اندراج کے لیے ہم نے اپنے پاسپورٹ داخل کیے۔ عام قاعدے کے مطابق تو ہمیں اپنے اپنے پاسپورٹ دس دن کے بعد ملتے، لیکن ہم نے ارجنٹ فیس --- دس روپے --- مزید ادا کی تو ہمیں اگلے روز اپنے پاسپورٹ مل گئے۔ اس کے بعد پانچ دن فرصت ہی فرصت تھی۔ اس میں بحرین کا ویزا بھی لیا گیا اور ٹکٹ بھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان سے نکلنے سے پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے ایک مزید اجازت حاصل کرنا اور پاسپورٹ پر ایک مہر لگوانا ضروری ہے۔ چنانچہ ان دنوں میں یہ مہم بھی سرانجام دی گئی۔ پاسپورٹ کا حصول اور پھر اپنے ملک سے نکلنے سے پہلے ویزا، ٹکٹ اور ایکسچینج کے لیے جو دوڑ دھوپ کی جاتی ہے وہ واقعی ایک زبردست مہم سے کم نہیں ہے۔ یہ اس زمانہ میں ہر ملک پر وطنی قومیت کا بھوت سوار ہونے کا نتیجہ ہے۔ گویا اپنے ملک سے نکلنے یا باہر سے اندر آنے والا ہر شخص ایک چور ہے جس کی ہر طرح پر سخت جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی اپنی حکومتوں کے درمیان ایک مسلمان کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کا یہ چکر اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل فضول اور غلط بات ہے۔ ساتویں صدی میں ابن بطوطہ مراکش سے چین تک پھر گیا۔ محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور یہاں کئی سال تک مقیم رہا۔ یہاں اس نے شادی بھی کی اور قاضی کے عہدے پر بھی فائز رہا اور سفیر بنا کر بھیجا گیا، لیکن کسی موقع پر اسے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہ پڑی۔

کراچی میں قیام کے دس دن اس دوڑ دھوپ کی نذر ہوئے یا پھر احباب و رفقاء سے ملاقاتیں رہیں اور ان کی مختلف دعوتوں میں شرکت۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولانا لاہور سے چلتے وقت اپنے ساتھ تفہیم القرآن کا کچھ کام لے آئے تھے، ورنہ معلوم ان کے یہ بے کاری کے دن کیونکر کٹتے۔ مولانا نے

تفہیم القرآن کی قسط دو برائے ترجمان القرآن ماہ نومبر و دسمبر، ان ہی دنوں میں لکھی اور اپنے بعض ادھورے مضامین بھی مکمل کیے۔

کراچی سے بحرین (۳ تا ۸ نومبر) جہاز ران کمپنی کا اعلان تھا کہ اب اس کا آئندہ جہاز جس کا نام داریسا (DARISA) تھا، ۳ نومبر کی شام کراچی سے روانہ ہو گا۔ گن گن کر انتظار کے دن پورے ہوئے اور نومبر کی ۳ تاریخ پہنچ گئی۔ ہم نے اپنی ضرورت کی چیزیں سب خرید لی تھیں اور سامان تیار کر لیا تھا۔ دوسری ضروریات کے علاوہ مولانا کو پانوں کی بڑی فکر تھی، کیونکہ تمام عرب ممالک اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم اور اکثر تو سرے سے ناواقف بھی ہیں۔ اگرچہ جدہ میں ان کے مل جانے کی توقع تھی، لیکن جب تک ہم جدہ نہیں پہنچ جاتے، راستے کے لیے ان کی ایک اچھی خاصی مقدار کا یہیں سے لے جانا ضروری تھا۔ مولانا نے تین سو کے قریب پان منگوائے اور ایک خاص طریقہ سے انہیں کاٹ کر ٹوکری میں رکھا۔

مولانا کا ٹکٹ فسٹ کلاس کا تھا اور ان کا کیبن بھی ریزرو تھا، اس لیے انہیں وقت سے بہت زیادہ پہلے بندرگاہ پر پہنچنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن میرا ٹکٹ "ڈیک" کا تھا اور مجھے ڈیک پر اپنی جگہ کے لیے جدوجہد کرنا تھی، اس لیے میں ۳ بجے کے قریب ہی بندرگاہ پہنچ گیا۔ بعض دوست ساتھ تھے اور اکثر سے بندرگاہ پر ملاقات ہوئی جو مولانا سے ملاقات کے لیے اُن کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان دنوں چونکہ عراق کی زیارتوں کا سلسلہ بند ہے اور عراق کے لیے لوگوں کو ویزا ابھی نہیں دیا جاتا، اس لیے جہاز کے لیے مسافروں کی بھیڑ بہت کم ہوگی لیکن جب میں بندرگاہ پر پہنچا تو مسافروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ کراچی سے جو لوگ پاکستان کی اپنی بندرگاہ گوادر جاتے ہیں، وہ اسی جہاز سے سفر کرتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے بھیڑ بھی تھی۔ ایک لمبی لائن میں کھڑے ہو کر پہلے میں نے اپنے پاسپورٹ پر پولیس والوں کی مہر لگوائی۔ بحرین اترتے وقت پولیس والوں کو جو کارڈ پُر کر کے دینا ہوتا ہے، وہ بھی یہیں سے مل گیا۔ پھر سامان کی چیکنگ ہوئی۔ بحری جہاز میں مسافروں پر سامان کے سلسلے میں گاڑی اور ہوائی جہاز کی طرح ایک مقررہ وزن کی

نیند نہیں ہوتی، اس لیے میں نے اپنے دو بکس بھی مولانا ہی کے حوالے کر دیے تھے اور سیکنڈ کلاس والوں کے سامان کی چیکنگ بھی بڑی شرافت اور معقولیت سے کی جاتی ہے۔ یہ تو ڈیک کے مسافر ہی ہیں جن پر ہر قسم کی بے قاعدگی اور سمگلنگ کا شبہ کیا جاتا ہے اور ان کے سامان کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے۔ ہر جگہ غریب۔ پبلک ۔۔۔ جمہور ۔۔۔ کا یہی حال ہے۔ اب میرے پاس صرف ایک بستر تھا اور ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ، اس لیے چیکنگ میں مجھے بھی کوئی پریشانی پیش نہیں آئی چیکنگ کے بعد جہاز پر آیا تو وہاں کوئی جگہ ایسی نظر نہ آئی، جہاں اپنا بستر لگا سکوں۔ تلاش کے بعد ایک کونے میں جہاں کوئی سائبان تک نہیں تھا، اپنا بستر لگا لیا اور مولانا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

۵ بجے کے قریب مولانا تشریف لائے۔ الحمد للہ سامان کی چیکنگ میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور ان کے پاسپورٹ پر پولیس والوں کی مُہر بھی جہاز پر سوار ہونے کے ساتھ ہی لگی۔ احباب و رفقاء کی ایک کثیر تعداد تھی جس نے جہاز پر سوار ہوتے وقت مولانا کو الوداع کہی۔ ماہر القادری صاحب، خورشید صاحب، اور مولانا کے صاحبزادے احمد فاروق مولانا کے ساتھ جہاز کے اندر تک آئے۔ مولانا کے کیبن کا نمبر ۱ تھا جس میں کوئی دوسرا مسافر ان کا شریک نہیں تھا۔ اس کا غسل خانہ اور بیت الخلاء بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ فسٹ کلاس کے عام کیبنوں میں یہ سہولت نہیں ہوتی۔ ہر کیبن میں کم از کم دو مسافر ہوتے ہیں اور بیت الخلاء اور غسل خانہ تو کئی کئی کیبنوں کا مشترک ہوتا ہے۔ اس لیے فسٹ کلاس کا ٹکٹ لینے پر بھی کسی شریف آدمی کو یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ کسی رند بلا نوش سے اس کا ساتھ نہیں ہو جائے گا۔

۵½ بجے کے قریب جہاز روانہ ہوا۔ دوسرے لوگ تو جہاز کی روانگی سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں مولانا کے پاس رہا اور عشاء کے قریب اپنی جگہ پر آ گیا۔ آئندہ جتنے دن جہاز کا سفر رہا، مجھے بھی یہ سہولت رہی کہ دن میں جب ضرورت پڑتی بلا کسی کے اعتراض کے بغیر مولانا کے پاس آ جاتا اور اکثر وہیں بیٹھ کر مطالعہ وغیرہ کرتا تھا۔ البتہ عشاء کے بعد اپنی جگہ آنا ضروری ہوتا تھا، کیونکہ رات کے وقت جہاز والے ڈیک سے اوپر آنے کے تمام راستے بند کر دیتے ہیں۔

اگلے روز ۲ بجے کے قریب ہمارا جہاز پاکستان کی بندرگاہ گوادر پہنچا۔ یہاں چونکہ کوئی باقاعدہ بندرگاہ نہیں ہے، اس لیے جہاز خشکی سے ایک ڈیڑھ میل دور ٹھہرتا ہے اور لوگ کشتیوں کے ذریعے خشکی اور جہاز کے درمیان کا راستہ طے کرتے ہیں۔ جس وقت ہمارا جہاز وہاں پہنچا، سمندر میں قدرے تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں بادبانی کشتیوں کو جہاز تک پہنچنے کے لیے جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ راستہ طے کرنے میں انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا اور پھر سخت افراتفری کے عالم میں مسافر جہاز پر سوار ہوئے اور اترنے والے مسافر جہاز سے اُتر کر کشتیوں میں سوار ہوئے۔ اسے دیکھ کر مولانا فرمانے لگے کہ خدا کسی شریف آدمی کو یہاں نہ لائے۔

یہاں کے کسٹم آفیسر صاحب لاہور کے رہنے والے تھے، وہ بھی جہاز پر آئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ مولانا اس جہاز سے سفر کر رہے ہیں تو وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے اُن کے پاس پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ آج تو موسم پھر بھی غنیمت ہے، اس لیے مسافروں کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی، ورنہ جس دن موسم خراب ہو اور سمندر میں تیز ہوا چل رہی ہو تو یہاں بالکل قیامت کا سماں ہوتا ہے، خصوصاً گرمی کے موسم میں تو حالت بالکل ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ کراچی اور گوادر کے درمیان بحری جہاز کے سوا کوئی دوسرا معقول ذریعۂ آمد و رفت نہیں ہے، اس لیے مسافروں کی اچھی خاصی تعداد ہر جہاز سے اترتی اور اس میں سوار ہوتی ہے، لیکن ان کی سہولت کے لیے یہاں ایک بھی اچھی قسم کی کشتی نہیں ہے۔ صرف ایک لانچ ہے جس میں کسٹم کے عملہ کے لوگ آتے جاتے ہیں، باقی سب بادبانی کشتیاں ہیں جن کے لیے سمندر میں معمولی سی تیز مخالف ہوا کا مقابلہ کرنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ خشکی کے راستہ سے اگر لوگ سفر کرنا چاہیں تو انہیں پہلے کراچی سے کوئٹہ آنا پڑتا ہے اور پھر کوئٹہ سے گوادر جو تقریباً چھ سو میل کا فاصلہ ہے اور اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی پختہ بلکہ کوئی کچی سڑک بھی نہیں ہے۔ اس لیے یا تو مسافر پیدل چل کر یہ سارا راستہ طے کریں یا پھر اونٹوں کے ذریعے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہاں گوادر میں دو چار

عمدہ قسم کی لانچوں کا انتظام کر دیا جائے تاکہ مسافروں کو جہاز اور بندرگاہ کے درمیان اس مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے، جس کا سامنا انہیں اب کرنا پڑ رہا ہے۔

پاکستان کے قبضہ میں آنے سے پہلے گوادر سمگلنگ کا بہت ہی بڑا اڈہ تھا۔ جب پاکستان نے اس کا چارج لیا، تو پانچ کروڑ روپے کا صرف کپڑا یہاں موجود تھا حالانکہ دور سے دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ کسٹم آفیسر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں کو پاکستان میں باہر جانے کے لیے پاسپورٹ نہیں ملتا، وہ گوادر کا ٹکٹ لیکر کراچی سے جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں اور یہاں گوادر میں اترنے کے بجائے جہاز میں چھپ جاتے ہیں۔ انہیں بڑی دقت سے تلاش کرنا پڑتا ہے اور اسی لیے یہاں اکثر جہاز لیٹ ہو جاتے ہیں۔ اسی تلاش میں ہمارا جہاز بھی لیٹ ہو گیا۔ اگر لوگوں کو پاسپورٹ کی سہولتیں حاصل ہوں، تو وہ اس قسم کی بے قاعدگیاں کیوں کریں۔

اگلے روز ۵ نومبر کو ہمارا جہاز مسقط، ۶ کو دبئی اور ۷ کو ریاست قطر کی بندرگاہ ام سعید پہنچا۔ یہ سب خلیج فارس کے عرب ساحل پر چھوٹی چھوٹی عرب ریاستیں ہیں، جن پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ انگریزوں نے اگرچہ بظاہر یہاں کٹ پتلیوں کی طرح شیوخ بٹھا رکھے ہیں، لیکن عملاً نظم و نسق کی کنجی ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ شروع میں انگریزوں نے ان ریاستوں پر صرف اس لیے قبضہ جمایا تھا کہ خلیج فارس یعنی عراق و ہندوستان کے درمیان بحری راستہ پر ان کا قبضہ محفوظ رہے، لیکن جب سے ان ریاستوں میں پٹرول بھی نکل آیا ہے، انہوں نے پوری طاقت سے ان پر اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔

مسقط، دبئی اور ام سعید اگرچہ بڑی بندرگاہیں نہیں ہیں اور یہاں بھی جہاز خشکی سے دور ہی ٹھہرتا ہے، لیکن یہاں لانچوں کی وجہ سے مسافروں کو اترنے چڑھنے میں اس قسم کی دقت پیش نہیں آتی جس قسم کی گوادر میں ہم نے دیکھی۔

جس وقت ہمارا جہاز مسقط پہنچا، میں اوپر مولانا کے پاس تھا۔ جہاز کے چلنے کے بعد

جب میں نیچے اپنی جگہ پر آیا تو معلوم ہوا کہ مسقط کے کچھ دکاندار جہاز کے اندر آ گئے تھے اور انہوں نے یہاں باقاعدہ بازار لگایا اور لوگوں نے خوب خوب چیزیں خریدیں۔ پاکستان کا نوٹ یہاں نہیں چلتا، ہندوستانی نوٹ چلتا ہے اور وہ بھی وہ ہندوستانی نوٹ جو ہندوستان نے خاص طور پر خلیج فارس کی ریاستوں کے لیے تیار کیا ہے۔ پاکستان کے نوٹ کی قیمت اگرچہ سرکاری طور پر اس کے برابر ہے، لیکن جہاز کے بازار میں پاکستانی نوٹ کی قیمت اس کے مقابلے میں ۱۲ رہی۔ پھر اسی قسم کا بازار آگے چل کر دبئی اور ام سعید پر بھی لگا، بلکہ بعض دکانداروں نے تو جو در اصل مسافر تھے مستقل دکانیں جمالیں، جو چلتے جہاز میں بھی لگی رہیں۔ کپڑا، جوتے، بسکٹ، قلم الغرض ضرورت کی عام چیزوں میں کوئی ایسی نہ تھی جو اس بازار میں نہ ملتی ہو اور وہ بھی نہایت سستے داموں۔ ایک جاپانی چپل کی قیمت میں نے دریافت کی تو دکاندار نے دو روپے بتائی، حالانکہ اسی چپل کی قیمت لاہور و کراچی میں دس روپے کے قریب ہے۔ یہی حال کپڑے اور دوسری چیزوں کا بھی تھا۔

ہمارا یہ جہاز صرف سواری کا جہاز نہ تھا بلکہ سواری اور مال دونوں کا ملا جلا جہاز تھا، اسی لیے ہر بندرگاہ پر ٹھہرتا اور وہاں مسافروں کے علاوہ تجارتی سامان اتارنے اور چڑھانے کی وجہ سے کئی کئی گھنٹے رکا رہتا تھا۔ ام سعید پر جو سامان اترا ہم نے دیکھا کہ اس میں بڑی تعداد بوریوں میں بند خشک گوشت کی تھی جو غالباً آسٹریلیا سے مشینوں کے ذریعے کٹ کر آیا ہوگا۔ افسوس اہل عرب اس معاملہ میں بالکل بے حس ہو گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جہاز میں شراب خوب پی جاتی ہے، خصوصاً فسٹ اور سکینڈ کلاس کے مسافر تو گویا شراب پینے اور رنگ رلیاں منانے ہی کے لیے سفر کرتے ہیں۔ رات کے وقت جسے دیکھیے اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ جہاز کے عملہ کے ایک آدمی نے بتایا کہ کراچی میں جو لوگ جہاز پر آئے تھے، ان میں سے اکثر یہاں شراب پی کر گئے۔ جہاز پر شراب سستی بھی ملتی ہے اور اس کے لیے یہاں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ تک کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ تو آخر پینے والے اسے کیوں نہ پئیں؟

ہمارے اسی جہاز میں ضلع گجرات کے ایک مولوی صاحب کراچی سے بحرین جا رہے تھے۔ بحرین سے انہیں ہماری ہی طرح خبر جانا تھا اور پھر عمرہ کے لیے مکہ معظمہ۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے لیکن اپنے کیبن میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتے تھے، کیونکہ کیبن میں دوسرے مسافروں کی شراب نوشی کی وجہ سے ان کا اپنے کیبن میں بیٹھنا بہت مشکل تھا۔

جہاز میں کھانا دو طرز کا ہوتا ہے، انگریزی طرز کا اور ہندوستانی طرز کا بھی، اور پھر ہر کھانے کے فسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ تین درجے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی کھانے میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق بھی ہوتی ہے، لیکن جہاز والوں کا سارا اہتمام گویا انگریزی طرز کے کھانے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے تیسرے درجے کا کھانا بھی ہندوستانی طرز کے اول درجے کے کھانے سے بہتر ہوتا ہے، لیکن اس میں گوشت کے مشکوک ہونے کی وجہ سے کسی محتاط مسلمان کا اس میں شریک ہونا مشکل ہے۔ مولانا نے ہندوستانی طرز کے کھانے ہی کو ترجیح دی۔ یہ کھانا اگرچہ فسٹ کلاس کا تھا اور مولانا نے اس کی اجرت غالباً سو روپے سے زیادہ ہی ادا کی ہو گی، لیکن یہ نہایت ناقص قسم کا تھا، بالکل ہندوؤں کے طرز کا بنا ہوا۔ اس میں گھی بھی ردی قسم کا تھا، اس لیے مولانا چند وقت سے زیادہ اسے نہ نبھا سکے اور جہاز کی صاف اور کھلی فضا کے باوجود سفر کے آخری تین چار دن بس برائے نام ہی کھاتے رہے۔ ڈیک کے مسافروں کا ٹکٹ دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ کھانے سمیت بھی اور کھانے کے بغیر بھی۔ جو لوگ کھانے کے بغیر ٹکٹ لیتے ہیں، انہیں اپنے کھانے کا اہتمام خود کرنا پڑتا ہے، اور جو لوگ ٹکٹ کے ساتھ کھانے کی قیمت بھی ادا کرتے ہیں انہیں جہاز پر کھانا لنگر میں جا کر کھانا پڑتا ہے۔ پہلے سفر کی وجہ سے مجھے ڈیک کے اس کھانے کا حال معلوم تھا، اس لیے میں نے اپنا ٹکٹ کھانے کے بغیر ہی لے لیا تھا۔ جہاز پر پہنچ کر میں نے کچن کے مسلم منیجر کو چالیس روپے ادا کر کے فسٹ کلاس کے ہندوستانی طرز کے کھانے کا ٹکٹ بنوا لیا جو ایک تو میری اپنی جگہ پر آجاتا تھا اور دوسرے بہرحال اس قابل تھا کہ میرے جیسا آدمی اسے نبھا سکتا تھا۔

موسم غنیمت تھا اور سمندر میں بھی تلاطم نہیں تھا، اس لیے جہاز پر متلی یا سر میں گھمیری کی شکایت سے ہم لوگ بڑی حد تک محفوظ رہے۔ مولانا تو الحمدللہ بالکل محفوظ رہے مجھے ایک دن سر میں ہلکی سی گھمیری محسوس ہوئی لیکن وہ لیموں کا اچار کھا لینے سے دُور ہو گئی، ورنہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء میں جب میں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ گرمی کے موسم میں کراچی سے بصرہ کا سفر کیا تھا تو متلی اور دورانِ سر کی وجہ سے میرا بُرا حال ہُوا تھا۔

بحرین (۸ تا ۱۰ نومبر) ۸ نومبر کی صبح ۷ بجے کے قریب ہمارا جہاز بحرین پہنچ گیا بحرین خلیج فارس میں ایک بڑے اور دو چھوٹے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے، یوں صرف بڑے جزیرے کو بھی بحرین کہہ دیتے ہیں۔ اس بڑے جزیرے میں مَنامَہ نامی ایک ہی شہر ہے اور وہی بندرگاہ بھی ہے اور یہیں ہمارا جہاز بھی رُکا۔ اس کے قریب سمندر میں دُور تک پانی بہت ہی اوتھلا ہے اس لیے ہمارا جہاز بندرگاہ سے تقریباً ۴ میل دُور ٹھہرا۔ ۹ بجے کے قریب ہم جہاز سے اُتر کر لانچ میں سوار ہوئے۔ لانچ والے نے بندرگاہ تک پہنچانے کی اُجرت پانچ روپے فی کس وصول کی۔ ۱۱½ بجے کے قریب ہم بندرگاہ پہنچ گئے۔

جب تک ہم لانچ پر تھے، ہمارا خیال تھا کہ یہاں بحرین میں ہمیں جاننے والا کوئی شخص نہیں ہے، اس لیے ہم یہاں صرف چند گھنٹے ٹھہریں گے اور اس کے بعد لانچ یا ہوائی جہاز سے خُبَر (سعودی عرب) روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن جب لانچ خشکی کے قریب پہنچا تو جو لوگ مسافروں کو لینے کے لیے بندرگاہ پر آئے ہوئے تھے اُن میں چند صورتیں ہمیں ایسی دکھائی دیں جن کی نگاہیں گویا لانچ کے مسافروں میں ہمیں تلاش کر رہی تھیں۔ جب ہم لانچ سے اترے تو تین آدمیوں نے، جن میں سے ایک پاکستانی لباس میں تھے اور باقی دو عربی لباس میں، بڑھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ تعارف پر معلوم ہُوا کہ جو صاحب پاکستانی لباس میں ہیں وہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے ہیں اور عرصہ ڈیڑھ دو سال سے یہاں بحرین کے ایک پرائمری سکول (جس میں تمام بچے ہندوستانی و پاکستانی ہیں) کے ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اور ان کے دوسرے دو ساتھی یہیں بحرین کے

رہنے والے ہیں۔ جب ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع کیسے ہوئی، تو انہوں نے بتایا کہ خُبَر اور ظہران (سعودی عرب) میں بعض لوگوں کو آپ کے آنے کی اطلاع کراچی سے ہو گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہمیں اطلاع دی بلکہ ایک صاحب کو خاص طور پر آپ کو لینے کے لیے یہاں بھیجا ہے اور اس وقت یہ صاحب آپ کا استقبال جہاز ہی پر کرنے کے خیال سے ایک بحرینی دوست کے ساتھ جہاز تک گئے ہوئے ہیں۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اگلی لانچ سے یہ دونوں صاحب بھی آ گئے۔ جو صاحب ظہران سے آئے تھے وہ پاکستانی تھے اور ان کا نام اسماعیل خاں تھا۔ یہ بھی ضلع ہزارہ کے رہنے والے اور گزشتہ ۸ سال سے عرب امریکن تیل کمپنی (آرامکو) میں ملازمت کی وجہ سے ظہران میں مقیم تھے۔

جہاز سے اترتے وقت ہمیں اپنے پاسپورٹوں پر بحرین میں داخلے کی مہر لگوانی چاہیے تھی لیکن ہم اپنی ناواقفیت اور بے جا جلدی کی وجہ سے یہ مہر نہ لگوا سکے۔ اب اگر ہمارے جاننے والے یہ لوگ بندرگاہ پر موجود نہ ہوتے تو ہمیں بڑی پریشانی ہوتی، لیکن الحمدللہ ان کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور ان کے تعلقات کی وجہ سے یہ مہر وہیں لگ گئی۔ ہمارے سامان کی بھی گویا کوئی چیکنگ نہیں ہوئی اور اس طرح چند منٹوں سے زیادہ بندرگاہ پر ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک ہوٹل "فندق البحرین" (جس کا مالک ایک ایرانی تھا) پہنچے۔ منامہ بہت ہی خوب صورت شہر نظر آ رہا تھا، سڑکیں نہایت عمدہ تھیں اور تمام عمارتیں جدید طرز کی بنی ہوئی تھیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے پہلے ہی سے ہمارے لیے ہوٹل میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ ہم نے اس میں اپنا سامان رکھوایا اور کپڑے بدلے۔ اس کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں سے کچھ تو پاکستانی تھے اور زیادہ تر بحرین ہی کے رہنے والے تھے جنہوں نے مولانا کی عربی کتابیں یا المسلمون اور دوسرے عربی پرچوں میں ان کے مضامین پڑھے ہوتے تھے اور غائبانہ طور پر وہ مولانا سے اچھی طرح واقف تھے۔ دوپہر کا کھانا ہمارے پاکستانی دوست (جنہوں نے بندرگاہ پر ہمارا استقبال کیا تھا) اپنے گھر سے لے آئے معلوم ہوا

کہ ان کا گھر ہوٹل سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر ہمیں یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو نہیں اس قدر تکلف میں پڑنے کی اجازت نہ دیتے اور یہیں بازار سے کھانے کا کوئی انتظام کر لیتے اگرچہ ہمارا جی یہی چاہتا تھا کہ کم از کم آج کا کھانا اگر کوئی صاحب گھر سے لانے کی پیش کش کریں تو دل کی تمنا بر آئے، کیونکہ لگاتار کئی دن تک جہاز کا ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ہم بازاری کھانے "سے" اکتا گئے تھے۔ ہمارے علاوہ آٹھ دس آدمیوں نے مل کر یہ کھانا کھایا۔ کھانا پاکستانی طرز کا تھا اگرچہ کچھ عربی اثر لیے ہوئے۔ عربی اثر سے مراد یہ کہ اس میں مرچ بہت کم تھی، لیکن ہمارے بعض بحرینی دوستوں پر یہ بھی کچھ سخت ہی گذری۔ عرب ممالک میں لوگ سُرخ مرچ بالکل استعمال نہیں کرتے۔ بحرین میں ہندو پاکستان سے قربت کی وجہ سے کچھ لوگ اس کا استعمال کر لیتے ہیں لیکن عام باشندوں کا حال دوسرے عرب ممالک جیسا ہی ہے۔ اس پر دوسرا عربی اثر یہ تھا کہ اگرچہ یہ دو یا تین آدمیوں کے لیے تھا لیکن اس کی مقدار اتنی تھی کہ دس بارہ آدمیوں نے اسے خوب سیر ہو کر کھایا۔ عربوں کے ہاں یہ بڑی معیوب بات سمجھی جاتی ہے کہ مہمانوں کے سامنے کھانا ان کی تعداد کے مطابق رکھا جائے، بلکہ مہمانوں کی عزت افزائی اس میں ہے کہ کھانا ان کی تعداد سے بہت زیادہ ہو، تاکہ وہ جسے چاہیں اپنے ساتھ شامل کر سکیں۔

کھانے کے بعد ہم نے ان لوگوں سے اگلے روز خُبَر روانہ ہو جانے کی اجازت چاہی' مگر ان لوگوں نے کم از کم ایک ہفتہ بحرین میں ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ اپنے طور پر ان لوگوں نے ہماری ہفتہ بھر کی ملاقاتوں اور دوسری مصروفیات کا پروگرام بھی بنا رکھا تھا، لیکن ہمارے پاس وقت چونکہ کم تھا، اس لیے بالآخر یہ طے پایا کہ ہم دو دن ٹھیر کر ۱۰ نومبر کو خُبَر روانہ ہو جائیں گے۔

مغرب تک ہم لوگ ہوٹل ہی میں رہے اور ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رات کو المحرّق (بحرین کا دوسرا چھوٹا جزیرہ جو منامہ سے ایک ایسے پُل کے ذریعے ملا ہوا ہے جو جہازوں کے گزرنے کے لیے اٹھا دیا جاتا ہے اور دوسرے اوقات میں لگا رہتا ہے)

میں ایک عرب دوست کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ مغرب کے بعد چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچے، وہاں پندرہ کے قریب سنجیدہ اور پڑھے لکھے نوجوان موجود تھے جنہوں نے بڑی گرمجوشی اور محبت سے مولانا کا استقبال کیا۔ پھر تعارف ہوا۔ عشا کی نماز ہم نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر کھانا کھایا۔ کھانے پر عربی تہذیب اور عربی ذوق غالب تھا۔ دستر خوان پر کئی طرح کے کھانے رکھے ہوئے تھے، لیکن کسی میں سرخ مرچ نہ تھی۔ گویا اس سفر میں آج ہماری بلا مرچ کا کھانا کھانے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ویسے ان لوگوں نے ہمارے ہند و پاکستانی ذوق کا بھی لحاظ رکھا اور وہ اس طرح کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی پلیٹ میں پسی ہوئی مرچ رکھ دی، تاکہ ہم اپنے طور پر جس کھانے پر چاہیں اسے ڈال کر کھاتے رہیں۔ تمام کھانے بڑے اہتمام اور تکلف سے تیار کیے گئے تھے اور ہمارے بحرینی دوست خوب مزا لے لے کر انہیں کھا رہے تھے، لیکن مرچ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں کسی کھانے میں مزا نہ آ رہا تھا۔ ہم یہ سوچتے ہی رہے کہ آخر یہ لوگ مرچ کے بغیر کیسے کھانا کھا لیتے ہیں۔ بہرحال جہاں تک ہو سکا، ہم نے پسی ہوئی مرچ سے پھیکے پن کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ کھانے کے بعد چائے آئی اور وہ دودھ کے بغیر۔ گزشتہ سفر میں بھی ہمیں دودھ کے بغیر چائے سے سابقہ پیش آ رہا تھا، لیکن ہم اکثر موقعوں پر یا تو معذرت کرتے رہے تھے یا جہاں بے تکلفی ہوتی تھی وہاں دودھ طلب کر لیا کرتے تھے، لیکن یہاں معذرت کرنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ عرب ملکوں کے لوگ چائے میں دودھ ڈالنا جانتے ہی نہیں۔ اور پھر ان ملکوں میں اس کثرت سے چائے پی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں بہت کم لوگ دودھ کے ساتھ بھی اتنی چائے پی سکتے ہیں۔ تعجب یہ کہ جو ملک زیادہ گرم ہیں وہاں زیادہ چائے پی جاتی ہے۔ عراق کے لوگوں میں سے ہر شخص ہر روز پندرہ بیس پیالیاں چائے پی جاتا ہے اور پھر ان کی چائے بھی اس قدر سیاہ اور سخت ہوتی ہے کہ اگر میرے جیسا آدمی صبح کے وقت ایک پیالی پی لے، تو رات تک سر کو لے کر پڑا رہے۔ عراق کے بعد دوسرا نمبر حجاز اور پھر دوسرے ممالک کا ہے۔ شام ایک ایسا ملک ہے جہاں کی آب و ہوا

اگرچہ نہایت ٹھنڈی ہے۔ لیکن وہاں لوگوں کو چائے پینے کی بہت کم عادت ہے اور مقدار کی کمی کے علاوہ ان کی چائے بھی اتنی ہلکی ہوتی ہے کہ عراق والے کہتے ہیں کہ ایسی چائے تو ہم اپنے بچوں کو دیتے ہیں، اسی لیے شام کے لوگوں کی صحت بہت عمدہ ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگوں کے آنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ لوگ مختلف موضوعوں پر مولانا سے سوالات کریں اور مولانا ان کے جوابات دیں۔ سوالات عام طور پر پاکستان، ہندوستان اور کشمیر میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق تھے۔ یا یہ کہ اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کیسے کیا جائے۔ ایک چیز جو ان سوالات سے ظاہر ہوتی تھی وہ یہ کہ ان لوگوں میں چونکہ اپنے ہاں کے حالات کو دیکھ کر خیر پر شر کے غلبہ کا احساس بہت زیادہ ہے اور وہ یہ بھی پوری طرح سمجھتے ہیں کہ کس طرح وہ پورے عالمِ اسلامی سے کٹ گئے ہیں، اس لیے ان میں اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ بہت ہے۔ یہ صرف اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی ان کو سیدھے راستے پر ڈال دے، اسی لیے یہاں اگر کسی عالمِ دین کا گزر ہو جاتا ہے تو ان لوگوں کے لیے وہ بڑی ہی نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے۔ مولانا ان کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت مؤثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کرتے تو شاید وہ اتنی مؤثر نہ ہوتی۔ بعض لوگوں نے پاکستان کے موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق بھی سوالات کیے۔ لیکن مولانا نے ان سوالات کا جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ میں پاکستانی سیاسیات کو کراچی کے ساحل پر بطورِ امانت رکھ آیا ہوں اور جب واپس جاؤں گا تو اسے وصول کر لوں گا، اس لیے آپ لوگ اس کے متعلق مجھ سے سوالات نہ کریں۔ بعض سوالات سے اندازہ ہوا کہ یہاں بحرین میں چند تبلیغی جماعت سے متاثر حضرات بھی رہتے ہیں، جن کی باتوں سے بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ مولانا مودودی اور

تبلیغی جماعت کے درمیان کچھ بڑے اختلافات ہیں۔ "الفرقان" کے مضامین بھی اس خیال کو تقویت دینے کا سبب بنتے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ہمارے اور تبلیغی جماعت کے درمیان کوئی کشمکش یا مخالفت نہیں ہے دین کا کام وہ اپنی سمجھ اور طریق کار کے مطابق کر رہے ہیں اور ہم اپنی سمجھ اور طریق کار کے مطابق اس زمانہ میں باطل کا اس قدر غلبہ ہو چکا ہے کہ دو چار جماعتیں تو درکنار، اگر ایسی سینکڑوں جماعتیں بھی دین کا کام کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں تو وہ بھی کم ہیں اس لیے ایسی جماعتوں کے درمیان مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مخاصمت تو ان لوگوں کے درمیان ہوتی ہے جن کی ذہنیت دکانداروں جیسی ہوتی ہے اور وہ کوئی کام اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد اور ناموری کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے ان لوگوں کو تلقین کی کہ اس زمانہ میں جو لوگ بھی دین کا کام کر رہے ہیں، آپ ان سب کا لٹریچر پڑھیے ان کا کام دیکھیے، پھر جدھر اطمینان ہو جا کر خلوص کے ساتھ دین کی خدمت کیجیے، اور خواہ مخواہ دوسرے خادمان دین سے نہ الجھیے۔

سوالات کا سلسلہ تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ ۱۲ بجے کے قریب لوگوں نے خود ہی محسوس کیا کہ مولانا چونکہ آج ہی سفر سے آ رہے ہیں، اور بہت تھکے ہوتے ہونگے اس لیے انہیں آرام کرنے دیا جاتے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔

اگلے روز دوپہر تک ہم بازار میں اپنے لیے سفر سے متعلق ضروریات کی خرید و فروخت میں مصروف رہے۔ تمام بازار نہایت پُر رونق اور بیرونی سامان (خصوصاً انگلستان اور جاپان سے برآمد شدہ) سے بھرے ہوئے تھے، ضروریات تو ضروریات سامان تعیش میں سے بھی کوئی چیز ایسی نہ ہو گی، جو وہاں موجود نہ ہو اور قیمتیں بعض اوقات حیرت انگیز حد تک سستی۔ سنا ہے کہ یہاں بحرین میں باہر سے آنے والے سامان پر صرف دو فی صدی ڈیوٹی ہے، جبکہ یہ ڈیوٹی سعودی عرب میں بھی ۱۰ فی صدی ہے۔ اس لیے یہاں سعودی

عرب سے بھی بڑھ کر ارزانی ہے۔ ہمارے دوست اسماعیل خاں صاحب نے بتایا (اور بعد میں خُبَر پہنچ کر خود ہمیں بھی اس کا تجربہ ہو گیا) کہ جس چیز کی قیمت یہاں بحرین میں ایک روپیہ ہے اس کی قیمت خُبَر اور ظہران میں کم از کم ڈیڑھ روپیہ اور مکہ معظمہ و جدہ میں سوا روپیہ کے قریب ہے، اس لیے سعودی عرب سے بھی جو لوگ بحرین آتے یا بحرین سے گزرتے ہیں وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یہیں سے خریدتے ہیں۔

بازاروں میں عورتیں بہت کم نظر آئیں اور جو نظر آئیں وہ زیادہ تر برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ سنا ہے کہ یہاں کی عورتوں میں ابھی بے پردگی نہیں ہے، البتہ بعض عورتیں جنہیں فدا روشنی لگ گئی ہے وہ جھلملی شفاف سیاہ نقاب ڈالنے لگی ہیں جس سے چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ باقی سب موٹا نقاب ڈالتی ہیں۔ لیکن اب شامی، لبنانی اور مصری خواتین کے طفیل یاس لیاست میں مغربیت آ رہی ہے اور اونچے طبقے کی عورتیں تمام حیثیتوں سے میم صاحبہ بن گئی ہیں۔ مردوں میں بھی سوٹ پہنے ہوئے لوگ ہمیں بہت کم نظر آتے۔ اگر سب نہیں تو زیادہ تر لوگ اپنے اسی لمبے کرتے اور سر پر رومال کے ساتھ بازاروں میں پھر رہے تھے۔ یہی حال دکانداروں اور دفتروں کے ملازمین کا بھی تھا۔ سنا ہے یہ لوگ جو بھی بانکا پن اور فیشن پرستی کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے اسی لباس میں کرتے ہیں مثلاً نوجوان قسم کے لوگوں کے کُرتے ہم نے زیادہ تر ریشم کے اور ان کے سروں کے رومال نہایت باریک چکن کے دیکھے۔ شوقین قسم کے لوگ اس لمبے کرتے پر کوٹ بھی پہنتے ہیں، جو ہم لوگوں کو پہلی نظر میں بہت ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال خوشی ہے کہ یہ لوگ ابھی تک کم از کم لباس میں مغربی تہذیب سے بچے ہوئے ہیں، اگرچہ ان کے لمبے لمبے کرتے دیکھ کر مولانا تعجب کرتے رہے کہ معلوم نہیں یہ لوگ ان کرتوں کے ساتھ کام کیونکر کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں کے برقعے بھی عجیب طرز کے ہیں۔ بہت ہی بھاری ہیں۔ اور ناک پر ایک قسم کا لگام سا لگا ہوتا ہے۔ ایک دن مولانا نے فرمایا، عربوں کا بھی عجب حال ہے۔ ان کے پاس یا تو اپنا یہ پرانا لباس ہے جسے اس زمانہ میں بہر حال نہیں نبھایا جا سکتا، یا پھر یہ لوگ

چھوٹتے ہی مغربی لباس کی طرف لپک پڑے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ لباس میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ برابر ترمیم ہوتی رہی ہے، اس لیے ہمارے ہاں کے لوگ اسے نبھا سکتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی نبھاتے چلے جا رہے ہیں۔

شام کے وقت ہم یہاں کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ منامہ سے تین میل کے فاصلہ پر پرتگیزوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ ہے جو غالباً انہوں نے چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا ہو گا جبکہ وہ خلیج فارس میں عربوں کو بے دخل کرتے پھر رہے تھے۔ اب تو اس قلعہ کے صرف کھنڈر پائے جاتے ہیں، اصل قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔ اس قلعہ کے ساتھ ایک دار الآثار بھی ہے، لیکن اس میں سوائے نام کے کوئی چیز نہیں ہے۔ سنا ہے آج سے چند سال پیشتر ڈنمارک کے محکمہ آثار قدیمہ کی ایک جماعت اس قلعہ کے متعلق معلومات جمع کرنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ اس نے جب قلعہ کے اندر اور باہر کھدائی کی تو اسے قلعہ کے ساتھ فنیقیوں کے زمانہ کا ایک مدفون گاؤں ملا۔

قلعہ کے راستہ میں ایک مسجد آئی جس کے متعلق وہاں کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ یہ حضرت خالد بن ولید کے زمانہ کی مسجد ہے۔ معلوم نہیں یہ مقامی روایت کہاں تک صحیح ہے؟ واپسی میں قلعہ کے قریب ہم نے ایک جگہ دیکھی، جسے وہاں کے لوگ باآور کہتے ہیں۔ یہ نخلستان کے اندر کھجور کی جھونپڑیوں پر مشتمل ایک بستی ہے۔ گرمی کے موسم میں جب شہر کے پختہ مکانات بہت تپنا شروع ہو جاتے ہیں، تو لوگ شہر چھوڑ کر یہاں چلے آتے ہیں اور گرمی کے سخت دن یہیں گزارتے ہیں۔

مغرب کے بعد ہم اپنے پاکستانی دوست کے ہاں گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے عرب اور پاکستانی حضرات موجود تھے۔ کھانا کھایا، عشا کی نماز پڑھی اور پھر وہی سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج کے تمام سوالات صرف ایک موضوع کے متعلق تھے اور وہ یہ کہ اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کیونکر کیا جائے۔ آج کے یہ سوالات کل کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور علمی انداز لیے ہوئے تھے، اور جو لوگ سوالات کر رہے تھے وہ بھی کل کے لوگوں کی نسبت زیادہ پڑھے لکھے، سنجیدہ اور کام کا جذبہ رکھنے والے تھے، اگرچہ ان میں اکثر مایوسی کا شکار نظر

آ رہے تھے۔ مولانا کے جوابات سے یہ لوگ بڑی حد تک مطمئن ہو گئے۔ یہ سلسلہ رات کے ا بجے تک جاری رہا اور اس کے بعد ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔

بحرین جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تین چھوٹے چھوٹے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے جن کا کل رقبہ ۴۰۰ مربع میل ہے۔ ان میں بڑا جزیرہ ۲۵ میل لمبا اور تقریباً ۱۲ میل چوڑا ہے اور اس کی کل آبادی ایک لاکھ ستر ہزار ہے۔ سارا جزیرہ میدان ہے اور یہاں کوئی اونچا پہاڑ نہیں ہے۔ صرف ایک ٹیلا ہے جو یہاں کا سب سے اونچا پہاڑ کہلاتا ہے۔ اس کا نام جبل الدخان ہے اور اس کی کل اونچائی ۴۵۰ فٹ ہے۔ آج سے دس سال پیشتر تک بحرین میں کھجور کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی تھی، اور یہ ایک چھوٹی سی غریب ریاست تھی، لیکن پٹرول نکل آنے کے بعد یہاں کی قسمت ہی بدل گئی ہے۔ اب سنا ہے کہ یہاں پٹرول کے کل ۲۲۰ کنوئیں ہیں۔

آبادی میں عراق کی طرح شیعہ اور سنی تقریباً برابر ہیں، خصوصاً دیہات میں زیادہ آبادی شیعوں کی ہے۔ تجارت کا بھی بڑا حصہ شیعہ تاجروں کے ہاتھ میں ہے اور شیعوں کا رجحان ایران کی طرف ہے۔ اس چیز کا ایران کے اس دعوے میں جو وہ بحرین کے متعلق رکھتا ہے، بڑا دخل ہے۔ خود فارسی بولنے والوں کی تعداد یہاں بھی اچھی خاصی ہے، جو سب کے سب شیعہ ہیں اور غالباً ایران کے زمانۂ تسلط میں یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ خصوصاً ہوٹلوں کے مالک اور مزدور تو سب کے سب یہی لوگ ہیں۔

اہلِ سنت میں اکثریت شافعیہ کی ہے، لیکن سرکاری مذہب مالکی ہے، کیونکہ فرمانروا خاندان مالکی مذہب کا پیرو ہے۔

انگریزوں کی گرفت یہاں بہت سخت ہے۔ حکومت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور شیخ محض برائے نام ہے۔ کمپنی کی طرف سے جو رائلٹی انہیں ملتی ہے وہ اس میں مگن ہیں اور خوب دادِ عیش دے رہے ہیں۔ اس رائلٹی اور اس میں اضافہ کے سوا انہیں کسی چیز سے گویا دلچسپی نہیں ہے۔

شہریوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی جا سکتی، بلکہ محدود معنوں میں مذہب کے لیے بھی اجتماعی طور پر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ جمعہ کے روز مساجد میں خطیب حضرات اس وقت تک کوئی خطبہ نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنا خطبہ پہلے سے لکھ کر حکومت سے پاس نہ کرا لیں۔ خفیہ پولیس کا نظام بہت ہی سخت ہے۔ کسی کی تقریر یا تحریر سے آزادی کی ذرا سی بو بھی آتی ہے، اُسے یک لخت بحرین سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص دوسرے سے بات کرتا ہوا ڈرتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جو لوگ ہم سے ہوٹل میں ملنے آیا کرتے تھے، وہ بھی اکٹھے ہو کر نہ ہمارے پاس آتے تھے اور نہ بازار میں چلتے تھے۔

یہاں سفید آبادی کے لیے عام آبادی سے دُور ایک الگ جگہ مقرر ہے جو یہاں کی سب سے اونچی جگہ ہے اور اسے عوالی کہا جاتا ہے۔

عرب قومیت کا فتنہ یہاں روز بروز پھیل رہا ہے اور اس کے زیر اثر غیر عرب مسلمانوں کے خلاف جتنا تعصب ہے، اتنا غیر مسلم عربوں کے خلاف نہیں ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد یہاں چند ہزار تک ہے، لیکن یہ تعداد عربوں کے تعصب کی وجہ سے دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ عربوں کی طرف سے تیل کی کمپنی پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ غیر عرب سٹاف نہ رکھے اور جو غیر عرب سٹاف پہلے سے موجود ہے اُسے جلد سے جلد رخصت کرے۔ کہتے ہیں کہ پاکستانیوں کے خلاف اس تعصب کے پھیلانے میں مصری پراپیگنڈہ نے خاص طور پر کام کیا ہے۔

بحرین کی اصل زبان تو عربی ہے اور انگریزی اب سرکاری طور پر مسلط ہو گئی ہے۔ لیکن یہاں فارسی اور اردو بھی خوب بولی اور سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ان دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ خود اہلِ بحرین اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا وہ ان کی اپنی زبان کے الفاظ ہیں۔ راستہ، سیدھا، دروازہ، پنکھا، تازہ اور اس طرح کے کتنے ہی الفاظ ہیں جنھیں

اہل بحرین بلا تکلف استعمال کرتے ہیں ۔ "بند کرنے" کے لیے انہوں نے بَنَّدَ یُبَنِّدُ ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے ، جسے یہ لوگ اپنا ہی لفظ سمجھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں ۔ صرف فارسی جاننے والے کو تو خیر کوئی دقت ہی نہیں ۔ اگر کوئی صرف اردو جاننے والا آدمی بھی وہاں چلا جائے تو انشاء اللہ اسے اپنا کام چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی ۔

بحرین میں ایک ایسی قبیح عادت کا ذکر سننے میں آیا جسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے ، لیکن اس کا ذکر کیے بغیر یہاں کے اجتماعی حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا ۔ غالباً اسلامی دنیا میں بحرین وہ واحد ریاست ہے جہاں بیسواؤں کی طرح لڑکوں کو بھی بدکاری کے لیے باقاعدہ حکومت کی طرف سے لائسنس دیا جاتا ہے ۔ اس برائی کا علم اگرچہ چند سال پیشتر ایک فلسطینی دوست کے ذریعہ ہوا تھا ، مگر یقین نہ آیا تھا ۔ اب خود بحرین کے متعدد باشندوں کی زبان سے اس کی تصدیق ہو گئی ۔ لا حول ولا قوۃ . . . . .

(باقی)